ظہور نظؔر کی شاعری کے رنگ

ڈاکٹر ثوبیہ نسیم، لیکچرار شعبۂ اُردو، گورنمنٹ رابعہ بصری کالج والٹن روڈ، لاہور

Abstract

Zahoor Nazar, belonged to Bahawalpur, was a great poet and a multidimensional personality. This study is an effort to acknowledge his contribution to not only literary world of Pakistan but also to develop political awareness amongst masses of Pakistan.

جب کربِ ذات کے ساتھ ساتھ سماج کا دکھ، معاشرتی ناانصافیاں، طبقاتی تقسیم، بھوک کے ستائے ہوئے لوگوں کی سسکیاں، کسی حساس انسان کو سنائی دیتی ہیں تو پھر وہ بے چین ہو جاتا ہے تب اُس کے جذبات کو ایک زبان ملتی ہے، لفظ بولنے لگتے ہیں اور روح کی تار پر ارتعاش پیدا ہونے لگتا ہے۔ جب اِن احساسات کو لفظوں میں بیان کیا جائے تو اس کو شاعری کہا جاتا ہے۔ ایسی شاعری کے ایک نمائندہ شاعر نے ایسے ہی حالات میں آنکھ کھولی جس کو دنیا ظہور نظؔر کے نام سے جانتی ہے۔ اُن کی صحرائی آنکھوں کے مشاہدے میں ایسے ہی اسباب آئے جس میں دکھ جھیلتی اور اذیت پالتی زندگی سے ناآسودگی کے سوتے پھوٹتے تھے۔ اُن کو زندگی نے بسر کیا، واقعات نے انہیں گزارا، اور حالات نے انہیں ترتیب دیا۔ وہ ایک ایسا انسان تھا کہ مجبوریوں کی چٹان پر بیٹھا اپنی عمر بتاتا رہا، حالات سے ٹکراتا رہا اور ٹوٹ کر بھی ثابت قدم رہا۔ بے بسی نے بہت اُس کا راستہ روکنا چاہا لیکن وہ خاردار راستوں سے آبلہ پا گزرتا چلا گیا۔ ظہور نظؔر خطۂ بہاول پور میں اُردو کے نام ور شاعر اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے شاعری، تاثراتی تنقید، افسانہ نگاری اور ڈراما نگاری میں طبع آزمائی کی ہے۔ وہ نظم اور غزل دونوں میں یک ساں مہارت رکھتے تھے۔

ظہور نظؔر لفظ کی حرمت کے قائل تھے انہوں نے ہمیشہ لفظوں کا پاس رکھا اس لیے شاعری اُن سے باتیں کرتی ہے، الفاظ اُن کے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے ہر دور میں حالات کا مقابلہ کیا، کبھی لفظوں کی حرمت کو پامال نہیں ہونے دیا۔ وہ انتہائی خوددار اور شگفتہ مزاج انسان تھے لیکن کبھی کسی کی خوش آمد نہ کی اگر وہ چاہتے تو عام لوگوں کی طرح وہ بھی کوئی مقام و مرتبہ حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن

انہوں نے ہاتھوں کو تیشہ بنا کر پیٹ پالا، تنگ دستی میں بھی کسی کو اپنا ہم راز نہیں کیا۔ شعر کہتے تھے مگر شعر کھاتے نہ تھے۔ دنیا میں وہی شاعر زندہ رہا ہے جس نے حالات کی چکی میں پس کر شاعری کی ہے۔ ظہور نظؔر بھی اسی طرز کی ایک منفرد آواز تھے جس کے لیے ساز بھی الگ چاہیے تھا۔

ظہور نظر سہ لسانی شاعر تھے۔ اُنھوں نے اردو، پنجابی اور سرائیکی زبان میں شاعری کی، لیکن ادبی حلقوں میں اُن کی پہچان اُردو شاعر کے طور پر ہوئی۔ ظہور نظؔر کو نظم کے ساتھ غزل پر بھی عبور حاصل ہے۔ اُن کی نظم اور غزل کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی ''وفا کا سفر'' کے فلیپ پر لکھتے ہیں: ''وہ اس دور کا بہت باشعور نظم نگار اور بہت رسیلا غزل گو شاعر تھا۔''[۱]

اور اسی سبب سے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے دونوں انتخابوں (نظم وغزل) میں ظہور نظؔر کی شاعری شامل ہے نیز ان کی مرتب کردہ ادبی تاریخ میں بھی ظہور نظؔر کا ذکر موجود ہے۔

ظہور نظؔر نے دیگر اصناف کو بھی ذریعۂ اظہار بنایا جن میں حمد، نعت، سلام، گیت، قطعات اور فردیات شامل ہیں۔ ظہور نظؔر نے نہ صرف شاعری میں اپنی پہچان بنائی بلکہ خواجہ فرید کی کافیوں کا منظوم ترجمہ بھی کیا اور یہ کسی بھی شاعر کا شاعری پر گرفت کا ثبوت ہے۔ اُنھوں نے نہ صرف اُردو شاعری میں بلکہ سرائیکی اور پنجابی میں بھی خود کو منوایا۔ اُن کی پنجابی شاعری کے حوالہ سے احمد راہی کہتے ہیں:

> ''ظہور نظر میں پنجابی شاعری کا اتنا ٹیلنٹ (Talent) موجود تھا، اگر وہ مسلسل پنجابی نظمیں لکھتا رہتا تو مجھ سے بڑا شاعر ہوتا۔''[۲]

ظہور نظؔر کی شاعری اپنے اندر اس عہد کی پوری تاریخ سموئے ہوئے ہے اور اس میں اس دور کا معمولی سے معمولی ارتعاش محسوس کیا جاسکتا ہے۔ خواہ وہ جدوجہد آزادی کی داستان ہو یا ہجرت کے آلام، سیاسی دور کی صورتِ حال ہو یا مارشل لاء، ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ ہو یا سانحۂ مشرقی پاکستان کی کتھا، مسئلہ کشمیر ہو یا تیسری دنیا کے مسائل یا مختلف ممالک کی آزادی۔ ان کا ذاتی غم بھی آٹو بائیوگرافی کی بجائے جگ بیتی بن جاتا ہے۔ جس طرح ''خطوطِ غالب'' کے پس منظر میں ۱۸۵۷ء کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے اسی طرح ظہور نظؔر کی شاعری سے پاکستان کی عمومی تاریخ مرتب ہوسکتی ہے۔ ڈاکٹر سعادت سعید لکھتے ہیں:

> ''ظہور نظر کی نظمیں ......عشق کی گہرائیوں سے لے کر سماجی سطح کے المیوں تک، حب الوطنی کے خصائص سے لے کر قومی سانحوں کے پس منظر میں موجود سازشی عناصر تک، مقامی افراد سے ہمدردی سے لے کر بین الاقوامی انسان دوستی تک کے معاملے ان کی نظموں میں تنوع اور احساساتی پھیلاؤ کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔''[۳]

شہرت بخاری اپنی رائے کا اظہار اِن الفاظ میں کرتے ہیں:

''ظہور نظر کی شاعری میں غزل ہو یا نظم ، ایک پُر اسرار سا رَس ضرور ہے جس سے انسان لطف بھی حاصل کرتا ہے اور آ گہی بھی.....عصری آ گہی۔''[۴]

ظہور نظّر کے ہاں متنوع موضوعات ملتے ہیں۔ ناکامیِ عشق کا دکھ، جدائی کا کرب، نارسائی، محرومی، شکست، بے بسی، نااُمیدی، داخلی و معاشرتی حالات ، سیاسی وعصری واقعات، سماجی مسائل، مناظر فطرت اور داخلی و خارجی محرکات کے حوالے سے اُنہوں نے جو دیکھا اور محسوس کیا، اُسے صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا۔ظہور نظّر محبوبہ کی پہلی شرمیلی مسکان اور اس سے متعلق تمام کیفیات سے لے کر مناظر فطرت، انسانی جدوجہد، من کی بپتا، ہیروشیما کی چیخیں، ناگاساکی کی آہیں، چین ،عراق اور مصر کی آزادی کا گیت، افریقہ کی زنجیر کی جھنکار، الجیریا کے جانبازوں کی للکار، لوگوں کی جبری تقسیم اور نیٹوسیٹو کی تنظیم تک کے بارے میں اپنی رائے کھل کر دیتے ہیں اور کیوں نہ دیں شاعر ہیں اور کہتے ہیں:

''میں شاعر ہوں
میں جو بھی محسوس کروں گا
جو دیکھوں گا، وہی کہوں گا
چاہے وہ دکھ ہو یا سکھ ہو''[۵]

ظہور نظّر نے اپنے شعری سفر کا آغاز رومانیت سے کیا ۔ظہور نظّر بنیادی طور پر رومانی اور آفاقی شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کے مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ عشق ومحبت ظہور نظّر کے خمیر میں شامل تھے۔ ان کے ہاں عشق ومحبت کا جو تصور ملتا ہے وہ ناپختہ نہیں بلکہ ایک حساس اور مہذب انسان کی محبت کا تصور ہے اور یہ محبت ظہور نظّر کی ذات اور روح میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ وہ ناکامیِ عشق میں بھی محبوب کو قصوروار نہیں ٹھہراتے بلکہ اس کی ذمہ داری بھی سماجی اونچ نیچ کو قرار دیتے ہیں۔ مثلاً نظم ''شکست سے پہلے'' کے آغاز میں کہتے ہیں:

کاش میں فرق کی دیوار کو پگھلا سکتا
کاش یہ جبر کی زنجیر گراں کٹ جاتی
کاش وہ لمحۂ تنویر وطرب آ سکتا
جس کی آمد کے لیے جانِ بہار
سال ہا سال سرِ راہ گزار
میں نے چھپ کر تیرے سایوں کی عبادت کی ہے
دیدہ و دل تری راہوں میں نچھاور کر کے
تیرے قدموں کے نشانوں سے محبت کی ہے

اور جب تو نے پکارا تو ترے
محل کے بند دریچے نہ کھلے [۶]

ظہور نظر کے ہاں رومانوی رویوں میں اعتدال ہے۔ وہ بھی محبت کرتے ہیں لیکن اس میں اُن کی اپنی حدود و قیود ہیں۔ ظہور نظر کا محبوب گوشت پوست کا ایک انسانی اور ارضی وجود ہے۔ وہ ہر وقت محبوب کو اپنے آس پاس محسوس کرتے ہیں۔ محبوب کی بات سنتے اور اپنے دل کی بات کہتے ہیں۔ نظم ''آخری پوجا'' کے کچھ مصاریع ملاحظہ فرمائیں:

اور اُس نے مجھے ______،
سب مردوں سا، مکار فریبی مرد کہا
اور میں نے اسے ______،
کم ظرف کہا، بے مہر کہا، بے درد کہا [۷]

رومانیت کے حوالے سے ظہور نظر کی غزلیہ شاعری بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ تخیلی محبوب کی بجائے مادی محبوب سے محبت کرتے ہیں۔ ان کے ہاں عشق و محبت کا اظہار جسمانی کشش کے باوجود لطیف جذبے میں ہوتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

ے لذت کچھ اور فصلِ بہاراں کی بڑھ گئی
چھلکا جب اس کے بند قبا سے گلوں کا رنگ [۸]

☆

ے پھر ایسی کوئی شام مقدر نہ ہوئی جب
انگڑائی تری قوسِ قزح بن کے تنی تھی [۹]

ظہور نظر ایک حساس انسان تھے، اُن کی شاعری میں رومانیت، درد و کرب، جذبۂ عشق، فراق اور غمِ فراق کی گہری کیفیت، ذہنی و جذباتی پژمردگی، محرومی، شکست، بے بسی، احساسِ تنہائی اور نا اُمیدی جیسے موضوعات کو موثر پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز اور عصری مدو جزر نے ان کے اندر شدید احساسِ تنہائی پیدا کر دیا تھا۔ ظہور نظر نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ نفسانفسی کے عالم میں انہیں اپنے مسائل خود ہی حل کرنا ہیں۔ تنہائی کا یہ احساس ان کی شاعری میں جا بجا ملتا ہے:

ے اپنے آپ سے کرنے والی باتیں بھی اب ختم ہوئیں
یہ تنہائی ، یہ سنّاٹا ، یہ چپ کیسے تمام کریں؟ [۱۰]

یہاں ایک بات بہت اہم ہے اور وہ یہ کہ ظہور نظر جس دور سے گزر رہے تھے اُس وقت سوشلزم کی تحریک نے اپنا اثر بہت سے ادیبوں اور شعراء پر چھوڑا تھا، اُس کا اثر ظہور نظر نے بھی قبول کیا، اس لیے اُن کی

شاعری میں بھی سوشلزم کی جھلک نظر آتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ ایک مادی نظریہ ہے، اس کے باوجود سوشلزم بھی ایک رومانی تصور ہے۔ یعنی سب انسان برابر ہیں یا مستقبل میں برابر ہو جائیں گے۔ رومان کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ انسان بہادری اور ہمت سے اپنا فرض انجام دے۔ ظہور نظر کی شاعری اور شخصیت دونوں اس رویے سے مملو ہیں۔

ظہور نظر اپنے ذاتی مصائب و مسائل اور آلامِ حیات کے باوجود اپنے اِردگرد پھیلے انسانی مسائل پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ ظہور نظر ایک سچے محبِّ وطن پاکستانی اور دردِ دل رکھنے والے انسان تھے۔ ان کی نظمیں ارضِ وطن سے والہانہ محبت کی عکاسی کرتی ہیں۔ ''ایک ترمیم شدہ نظم''، ''آج کے دن کو زندہ رکھنا'' اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ انہوں نے تیسری دنیا کے محکوم عوام کی جدوجہد آزادی کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ''انقلابِ چین''، ''جاگتے جزیرے''، ''جھوم اے وادیٔ نیل''، ''دجلہ و نیل و فرات ایک ہوئے'' اور ''جنگ الجزائر''، اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ان کی شاعری میں وطن سے محبت بڑا موضوع ہے۔ وطن سے ان کی محبت غیر مشروط ہے۔ اس محبت کی پاداش میں انہیں دشمنِ دیں اور غدار جیسے سخت الزامات کا سامنا کرنا پڑا۔

نظم ''میں ترا کون ہوں'' میں کہتے ہیں:

میرے پیارے وطن!
میرے اچھے وطن!
لوگ کہتے ہیں میں تیرا غدّار ہوں
اپنے گھر کی سیہ رات کو چھوڑ کر
اجنبی صبحِ نو کا پرستار ہوں
غیر کا نقش ہوں، حامیٔ روس ہوں
دشمنِ دیں ہوں، ملحد ہوں، جاسوس ہوں [۱۱]

ظہور نظر نے سیاسی منافقت، جمہوریت دشمنی، رِیا کاری، سیاسی مکاری و چال بازی، عوام کی حالتِ زار، فوجی آمریت اور اعلیٰ طبقوں کے مظالم جیسے متنوع موضوعات اپنی شاعری میں پیش کیے ہیں۔ اس سلسلے میں شہرت بخاری لکھتے ہیں:

> ''بہرحال ایک بات نہایت اطمینان سے کہی جا سکتی ہے کہ گزشتہ چالیس برس میں جو شاعری ہمارے ہاں ہوئی ہے، ظہور نظر کی شاعری اس میں ایک قابلِ فخر متاع کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی غزل ہو یا نظم، اپنے عہدِ تخلیق کو خود بخود واضح کر دیتی ہے۔'' [۱۲]

برصغیر کے مسلمانوں کو جب تشکیلِ پاکستان کے بعد سیاست دانوں کی خود غرضی، لوٹ مار اور عیش

پرستی کی وجہ سے الم ناک صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا تو عوام نے احتجاج کیا، حکومتی جبر نے انہیں خاموش کروا دیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد پیش آنے والے تمام مسائل کی جھلک ظہور نظر کی شاعری میں کارفرما ہے۔ خواہ وہ ۱۹۵۸ء کا شب خوں ہو، یحییٰ خاں کا مارشل لا ہو، یا مشرقی پاکستان کی علیحدگی، بھٹو کی غیر منصفانہ پالیسایاں ہو یا ضیاء دور کی ظلمت، ظہور نظر کے ہاں ان تمام ادوار کی بھرپور تصویر کشی کی ہے۔ خوف و ہراس کی فضا کو ظہور نظر نظم ''تشدّد'' میں یوں بیان کرتے ہیں:

گر چکا ہے، مر چکا ہے سارا شہر
تھرتھراتی شاہراہوں، کانپتی گلیوں میں ملبے کے تلے
رُک گئی ہے رینگتے جسموں کی لہر
تھم گئی ہیں نالہ وفریاد وشیون کی صدائیں
کلبلاتے، چیختے، خائف پرندے بھی ہیں چپ
منہدم دیوار و دَر سے اُٹھنے والی گرد بھی
کھا گئیں بے داد کی ظالم ہوائیں
جانے کب آئیں گے ملبے کی تہوں میں دفن لوگوں کو بچانے والے لوگ؟
جانے کب آئیں گے پھر اس شہر، اس شہرِ غریباں کو بسانے والے لوگ؟[۱۳]

۱۹۵۸ء میں جب مارشل لا نافذ ہوا تو عوام کی اکثریت نے اس سے مثبت اُمیدیں وابستہ کر لیں لیکن اس طرزِ جمہوریت نے عوام پر ایسا جبر مسلط کر دیا کہ سانس لینا بھی مشکل ہو گیا۔ فوجی حکومت نے اپنی موجودگی کا جواز پیش کرنے کے لیے ۱۹۵۹ء میں کچھ سیاسی فیصلے کیے اور انہیں ''اصلاحات'' کا نام دیا۔ میڈیا کے ذریعے اس کو انقلاب اور تکمیل کا نام دیا گیا، ذرائع ابلاغ اور تحریر وتقریر پر پابندی عاید تھی، بے شمار شاعر اور ادیب حکومتی مفاد کی خاطر ان ''اصلاحات'' کو سراہنے میں مشغول تھے۔ ظہور نظر ان ''دیدہ وروں'' سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

ے کہہ لیجیے کہ اس موجِ تجلی کے جلو میں
جو کچھ بھی تقاضا تھا نگاہوں کا وہ سب ہے
اے دیدہ ورو! پھر بھی یہ جھٹلاؤ گے کیسے
شب کتنی ہی زرتاب ہو، پُرنور ہو، شب ہے [۱۴]

ظہور نظر نے اپنی ایک غزل میں بھی ان ''دیدہ وروں'' کی خوب خبر لی ہے:

ے دیدہ وروں کے گھر پہ مسلط ہے تیرگی
اندھوں کی انجمن میں چراغاں ہے ان دنوں
بدتر ہے جانور سے بھی دانش وروں کا حال
جو سوچتا نہیں ہے وہ انساں ہے ان دنوں [۱۵]

اس حقیقت کو سب مانتے ہیں کہ ہر ادیب و شاعر دور اندیش ہوتا ہے۔ آنے والے ہر دور کے تیور بھانپ لیتا ہے۔ ظہور نظر بھی ایک ایسے ہی شاعر تھے جو آنے والے دور کے قدموں کی چاپ سن رہے تھے۔ اس لیے انہوں بھانپ لیا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ دسمبر ۱۹۶۴ء کے صدارتی انتخاب نے مایوس عوام کے اندر نئی زندگی کی لہر پیدا کر دی۔ عوامی بیداری کی اس لہر کی پیش گوئی ظہور نظر نے پہلے ہی کر دی تھی:

ے وقت کے جنگل میں اِک پیڑ کی شاخ جلی تو ہے یارو
شاید پھیلے آگ ، ہوا کچھ تیز چلی تو ہے ، یارو
دیکھیں کب آغازِ سحر ہو ، دیکھیں کب سورج نکلے
کہتے ہیں آثارِ فلک ، کچھ رات ڈھلی تو ہے یارو [۱۶]

جہاں لوگ پہلے ہی بھوک اور تنگ دستی کی چکی میں پس رہے ہوں اور اوپر سے پہ در پہ مارشل لاء لگ رہا ہو تو لوگ کب تک اس کے خلاف آواز اُٹھاتے۔ آخر جب ایوب خاں نے مارشل لاء نافذ کیا تو لوگوں نے خاطر خواہ مزاحمت نہ کی۔ تو ظہور نظر نے ایوب خاں کے طویل آمرانہ حکومتی رویے کے خلاف عوام کی بے حسی کا اظہار یوں کیا:

جو مرے خون سے عبارت تھی
یاد وہ داستان تک بھی نہیں
کیا کریں گے وہ لوگ ہنگامہ
جن کے منہ میں زبان تک بھی نہیں[۱۷]

ایوب خاں کے طویل مارشل لا اور ۱۹۶۵ء کے بعد، ۱۹۶۹ء کے ابتدائی ایام میں ذوالفقار علی بھٹو کی ہنگامہ خیز تحریک پیپلز پارٹی کی صورت میں سامنے آئی جو سیاست کے ٹھہرے پانیوں میں پتھر کے مترادف تھی۔ اس پارٹی کے منشور میں مزدوروں، کسانوں، جبر و استحصال کا شکار طبقوں اور بائیں بازو کے دانش وروں کو اپنی آرزوؤں کی تکمیل اور دکھوں کا مداوا نظر آنے لگا۔ بھٹو کے نعرے ''روٹی، کپڑا اور مکان'' کا عوام نے خیر مقدم کیا۔ ظہور نظر نے ابتداء ہی میں پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی بلکہ ان کا شمار بہاول پور ڈویژن میں پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی اراکین میں ہوتا ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے زیر اثر خوش گوار تبدیلی اور انقلاب کو ظہور نظر نے نظم ''بشارت'' میں یوں پیش کیا ہے:

چشمۂ زیرِ زمیں ــــــــــ،
منتظر تھا جو نمودِ جوش کے ہنگام کا
موجِ اذنِ عام کا
پھوٹ کر ہر سمت و ساعت میں رواں ہونے کو ہے
انقلابِ ناگہاں ہونے کو ہے [۱۸]

۱۹۶۹ء کے مارشل لا کے نفاذ کے ساتھ ہی عوام کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ پیپلز پارٹی کی تحریک دب گئی، گلیوں اور بازاروں کی سیاسی رونقیں خاموشی میں بدل گئیں۔ اس صورتِ حال کو ظہور نظر نے اپنی نظم ''نئی رات، پرانا غم'' اور ''فن کار'' میں پیش کیا۔ ''فن کار'' کے چند مصاریع ملاحظہ فرمائیں:

مجھے خبر ہے کہ تم ــــــــــ،
جو آنکھوں میں اشک،
ہونٹوں پہ آہ ــــــــــ،
سینوں میں درد لے کر
کھڑے ہوئے ہنس رہے ہو!
ہنسا پڑا ہے تم کو ــــــــــ!!
کہ جبر سے بڑھ کے کوئی جادو نہیں جہاں میں!! [۱۹]

یحییٰ خاں نے جب دسمبر ۱۹۷۰ء میں عام انتخابات کے انعقاد کا اعلان کیا تو عوام کو ایک بار پھر اُمید کی کرن نظر آئی لیکن بار بار مارشل لا کے نفاذ کے پیشِ نظر عوام اُمید و ناامیدی اور یقین و بے یقینی کی کش مکش میں مبتلا تھے۔ ظہور نظر عوام کو اچھا وقت آنے کی نوید سنا رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

اے ستم گرو بولو!!
وقت ہے گواہی کا
حکم آن پہنچا ہے   میری دادخواہی کا
درد کی عدالت سے
صبر کی حکومت سے [۲۰]

جب انتخابات ہوئے تو لوگوں نے فرسودہ نظامِ سیاست کو رَد کر کے اپنی قسمت کا ترجمان عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی کو بنادیا۔ انتقالِ اقتدار کے ضمن میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان نفرتیں پیدا ہوئیں جس کے نتیجے میں پاکستانی عوام کو مشرقی پاکستان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ ظہور نظر نے نظم ''پاگل پن'' میں اس کا اظہار یوں کیا:

میرا دایاں ہاتھ، بائیں ہاتھ کو

کاٹنے میں رات دن مصروف ہے

....

روزنِ دیوار سے
آ رہی ہے میرے بدکردار ہمسائے کے ہنسنے کی صدا
آسماں پر دائرہ دَر دائرہ
چیختی چیلوں کا غول
منتظر ہے میرے بائیں ہاتھ کا
اور بایاں ہاتھ کٹ گرنے کو ہے[۲۱]

آخر کار پیپلز پارٹی کو اقتدار ملا تو ظہور نظر نے نظم ''سورج ذرا اوپر تو آلے'' میں قوم کو مایوسی اور نااُمیدی سے چھٹکارے کی نوید سنائی۔ آغازِ حکومت میں یہ جماعت اپنے منشور پر قائم رہی لیکن کچھ وقت بعد اُس کے تضادات سامنے آنے لگے، جس کے نتیجے میں ظہور نظر کو خاصی مایوسی ہوئی۔ ظہور نظر نظم ''جاگتی آنکھوں کا خواب'' میں کہتے ہیں:

وہ خواب اب ٹوٹ گیا ہے
جو میں نے دیکھا تھا
وہ خواب ــــــــ،
جس میں فضائیں شفیق تھیں مجھ پر
وہ خواب ــــــــ،
جس میں صداؤں نے میرا ساتھ دیا
وہ خواب ــــــــ،
جس میں ہوائیں رفیق تھیں میری[۲۲]

بھٹو کی نظریاتی ودانش ور قسم کے لوگوں اور نقاد عوام سے بے رُخی بڑھ گئی اور غیر منصفانہ سلوک کِیا جانے لگا۔ حکمران چاہتے تھے کہ یہ نظریاتی دانش ور حکومت پر نکتہ چینی کی بجائے قدیم درباریوں کی طرح ان کے قصیدے پڑھیں۔ اختلاف کرنے والوں کے ساتھ ناروا سلوک روا رکھا گیا جیسے مارشل لاء دور میں رکھا جاتا تھا۔ ظہور نظر نے اس صورتِ حال کا جائزہ اپنی شاعری میں پوری فن کارانہ صداقت اور جرأت کے ساتھ پیش کیا۔ نظم ''نیا چوراہا'' اسی پس منظر کی عکاسی کرتی ہے۔ اسی سلسلے میں غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ے یہ غم نہیں ہے کہ پیاسا مرا مسافرِ دشت
ہے رنج یہ کہ گھنا اَبر اُس کے سر پر تھا
صدا لگا بھی جو دیتا ، تو بھیک دیتا کون؟
گدا بھی میں تھا ، کھڑا بھی میں اپنے در پر تھا [۲۳]

ظہور نظر کی ارضِ پاک سے سچی محبت کی وجہ سے ان کی بصیرت انہیں مستقبل کا جو نقشہ دکھا رہی تھی وہ مایوس کن تھا۔ مثلاً ظہور نظر نے نظم ''نوشتہ دیوار'' کے ابتدائی حصے میں آنے والے وقت کے بارے میں واضح پیش گوئی کر دی تھی:

سنو______
کہ قبضہ تھا وقت پر جن کا
دن گنے جا چکے تھے ان کے
شمار صرف ان کی آخری شب کا رہ گیا ہے [۲۴]

ان حالات کا منطقی انجام ۵/ جولائی ۱۹۷۷ء کو مارشل لا کی صورت میں سامنے آیا۔ ملک کے بارہ کروڑ عوام کا مقدر فوج کو سونپ دیا گیا اور لوگوں کو ایک بار پھر بنیادی حقوق سے محروم کر دیا گیا۔ ''یہ جبر کی کون سی منزل ہے''، ''مجھے اس رہ گزر پہ چلنا ہے''، ''صورتِ حال سے ایک سوال'' اور ''یہ جنگل کون کاٹے گا'' اسی پس منظر کی نظمیں ہیں۔ آمرانہ حکومت عوامی جذبوں اور احساسات کو دبانے کے لیے ہر طرح کے ہتھ کنڈے استعمال کر رہی تھی لیکن خوف و جبر کے باوجود ظہور نظر اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

ے سزا قبول ، مگر اتنا سوچ لو کہ یہاں
جو تم سے پہلے تھے ، با اختیار وہ بھی تھے
سوادِ شہر سے بھی خاک اُڑ گئی جن کی
کبھی تمہاری طرح شہریار وہ بھی تھے [۲۵]

جب کوئی شاعر سوشلزم کے زیرِ اثر آتا ہے تو اُس کے کلام میں مزاحمتی رنگ ضرور نظر آتا ہے یہ معاملہ ظہور نظر کے ساتھ بھی ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک سے بھی وابستہ تھے اور اس تحریک کی امتیازی خصوصیت ہی مزاحمتی شاعری ہے کیوں کہ اس تحریک کا نعرہ ہی ادب برائے زندگی ہے۔ وہ مزدور طبقے اور غریب لوگوں کا استحصال ہوتا ہوا دیکھتے تو اس پر کڑھتے تھے اسی لیے ظہور نظر کی شاعری میں مزاحمتی رویہ اکثر مقامات پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ ظہور نظر کی مزاحمتی شاعری کی ایک مثال دیکھیں:

ظلم ہو ، جبر ہو ، بے داد ہو ، لکھنا ہوگا
لکھنا تو ہے مری اُفتاد ، سو لکھنا ہوگا
وقت ہے عدل کی تاریخ رقم کرنے کا
خود بھی ٹھہرو جو گنہ گار تو لکھنا ہوگا
کچھ نہ لکھو گے تو دیوار پہ لکھ دے گا تمھیں
یہ بُرا وقت ہے دانشورو ، لکھنا ہوگا [۲۶]

جو شاعر وقت کے بارے میں بات کرتا ہو وہ یقینی طور پر فلسفیانہ فکر کا حامل ہوتا ہے جس کی اُردو میں سب سے بڑی مثال علامہ اقبال ہیں۔ظہور نظر کی شاعری میں بھی وقت کا بہاؤ ایک اہم موضوع ہے۔ظہور نظر نے ''صحرائے خیال''، ''پت جھڑ کی ایک شام''،''برگ وہوا''، ''سراب حقیقت''،''ایک لمحہ اور کئی زمانے'' اور''تلاش'' میں مختلف اشکال میں وقت کے بہاؤ کو علامت بنا کر پیش کیا ہے۔ڈاکٹر عبدالخالق تنویر لکھتے ہیں:

''ظہور نظر وقت اور زمانے کے سفر پر مختلف زاویوں سے نگاہ ڈال کر نتائج اخذ کرتے ہیں۔ ان کے ہاں وقت کا ادراک مثبت اور بامعنی بن جاتا ہے جو قاری کو نئی سوچ اور نئے معنوی تناظر سے لطف اندوز ہونے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔''[۲۷]

ظہور نظر کا نام اِس عہد کے بڑے شاعروں میں ہونا چاہیے تھا۔اُن کو جتنا بھی خراجِ تحسین پیش کیا جائے کم ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ اُن کو اُن کی زندگی میں وہ مقام نہ ملا جس کے وہ مستحق تھے۔اُن کی شاعری کے بہت سے حوالے سامنے آچکے ہیں لیکن ابھی بھی بہت سی گنجائش باقی ہے ۔اُن کی شاعری کے کئی پہلو تشنہ ہیں اگر اُن کو کریدا جائے تو اُن کی زندگی اور شاعری کے وہ پوشیدہ گوشے سامنے آئیں گے جو اب تک ہماری نظروں سے اوجھل ہیں۔البتہ ایک بات قابلِ غور ہے کہ علامہ اقبال جیسے دوراندیش شاعر نے فنون لطیفہ میں شاعری کے حوالے سے جو تنقیدی نکات اور معیار بنائے تھے،ظہور نظر بطور شاعر تخلیقی وتنقیدی لحاظ سے اس پر پورا اُترتے ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ احمد ندیم قاسمی،فلیپ،''وفا کا سفر''

۲۔ عبدالخالق تنویر، ڈاکٹر،''ظہور نظر شخصیت و فن......(احمد راہی سے گفتگو)''،مشمولہ''الحمراء''(لاہور،جنوری ۲۰۱۳ء)،ص ۸۸

۳۔ سعادت سعید، ڈاکٹر،''ظہور نظر کی نظمیں''،مشمولہ''نئی قدریں''،حیدرآباد(سندھ)، شمارہ نمبر(۴۔۳)،۱۹۸۴ء،ص ۲۲

۴۔ شہرت بخاری، ''کلیاتِ ظہور نظر (تبصرہ)''، مشمولہ ''ماہِ نو''، (لاہور، نومبر ۱۹۸۸ء) ص ۸۸
۵۔ ثوبیہ نسیم، ڈاکٹر، ''تدوینِ کلیاتِ ظہور نظر ''، (مقالہ برائے پی ایچ ڈی اُردو، دی اسلامیہ یونی ورسٹی آف بہاول پور)، ص ۵۲
۶۔ ایضاً، ص ۲۰
۷۔ ایضاً، ص ۳۷۹
۸۔ ایضاً، ص ۴۲۷
۹۔ ایضاً، ص ۴۲۱
۱۰۔ ایضاً، ص ۴۵۲
۱۱۔ ایضاً، ص ۳۷
۱۲۔ شہرت بخاری، ''کلیاتِ ظہور نظر (تبصرہ)''، ص ۸۸
۱۳۔ ثوبیہ نسیم، ڈاکٹر، ''تدوینِ کلیاتِ ظہور نظر ''، (مقالہ برائے پی ایچ ڈی اُردو، دی اسلامیہ یونی ورسٹی آف بہاول پور)، ص ۵۸
۱۴۔ ایضاً، ص ۱۸۳
۱۵۔ ایضاً، ص ۴۷۸
۱۶۔ ایضاً، ص ۴۳۰
۱۷۔ ایضاً، ص ۴۷۱
۱۸۔ ایضاً، ص ۲۹۲
۱۹۔ ایضاً، ص ۳۰۰
۲۰۔ ایضاً، ص ۳۱۵
۲۱۔ ایضاً، ص ۳۱۹
۲۲۔ ایضاً، ص ۳۳
۲۳۔ ایضاً، ص ۵۴۲
۲۴۔ ایضاً، ص ۳۴۵
۲۵۔ ایضاً، ص ۵۴۳
۲۶۔ ایضاً، ص ۵۴۸
۲۷۔ عبدالخالق تنویر، ڈاکٹر، ''ظہور نظر کے شعری موضوعات ''، مشمولہ ''الحمراء''، (لاہور، جنوری ۲۰۱۳ء)، ص ۹۴

مآخذ:

۱۔ بخاری، شہرت، کلیاتِ ظہور نظر (تبصرہ)، مشمولہ ''ماہِ نو''، لاہور، نومبر ۱۹۸۸ء۔

۲۔ ثوبیہ نسیم، ڈاکٹر، تدوینِ کلیاتِ ظہور نظر، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اُردو، بہاول پور: دی اسلامیہ یونی ورسٹی۔

۳۔ سعادت سعید، ڈاکٹر، ظہور نظر کی نظمیں، مشمولہ ''نئی قدریں''، حیدر آباد (سندھ)، ۱۹۸۴ء۔

۴۔ عبدالخالق تنویر، ڈاکٹر، ظہور نظر کے شعری موضوعات، مشمولہ ''الحمراء''، لاہور، جنوری ۲۰۱۳ء۔

☆☆☆